R. No. 218557

Regd. No. 988

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Tele. No. 29

Telegrams

"ANJUMAN"

جلد ۲۲ - شمارہ ۱۹	ایڈیٹر - آل احمد سرور	۱۵ مئی ۱۹۶۳ء

محمد انصار اللہ نظر

شاہ نصیر کی دکن سے واپسی

شاہ نصیر جہاں گرد قسم کے انسان تھے، انھوں نے مختلف مقامات کے سفر کیے۔ خصوصاً لکھنؤ[1] اور دکن جانے کا ذکر اکثر آتا ہے، اس موقع پر ہم ان کے دکن کے مختلف سفروں کے زمانہ کا تعین کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے دوسرے شعرا مثلاً ذوق وغیرہ کے حالات کے مطالعہ میں بھی مدد ملتی ہے اور خود شاہ صاحب کے کلام کے تحقیقی مطالعہ کے سلسلے میں ان سفروں کی اہمیت ظاہر ہے۔

سخاوت مرزا صاحب نے "شاہ نصیر دہلوی" کے متعلق ایک طویل مضمون "اردو" بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع کیا تھا، اس میں انھوں نے خزینۂ سخن (مجموعہ قصاید مدح ارسطو جاہ) مولفہ شاہ تجلی (وفات ۱۲۱۵ھ) تالیف ۱۲۱۱ھ کا بھی ذکر کیا ہے جس میں شاہ صاحب کا ایک قصیدہ شامل ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید شاہ صاحب پہلی مرتبہ ۱۲۱۱ھ سے کچھ قبل حیدرآباد تشریف لے گئے تھے اور ارسطو جاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، یہ زمانہ وہ ہے جب دیوان[2] چندو لال کو ابھی تک "راجہ" کا خطاب نہیں ملا تھا، ایسی صورت میں شاہ صاحب کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ انھوں نے راجہ چندو لال کی دعوت پر ہی حیدرآباد کا قصد کیا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

البتہ یہ امر واقعی ہے کہ راجہ چندو لال نے اپنے دور میں شاہ نصیر کی ہر طرح قدر دانی کی۔ تعجب یہ ہے کہ تذکرہ سرور، مجموعہ نغز[1]، تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا، دستور الفصاحت وغیرہ تذکروں میں شاہ صاحب کے اس ابتدائی سفر کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔

۱۲۲۱ھ کے قریب شاہ صاحب دلی میں موجود تھے چنانچہ قائم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق[2] نے ابتداءً ان سے اصلاح لی، آزاد[3] کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب شاہ عالم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد پھر دکن چلے گئے ان کی جگہ میر بیقرار، ظفر کو اصلاح دینے پر متعین ہوئے وہ بھی چلے گئے[4] تو ۱۲۲۳ھ میں ذوق کو یہ خدمت سپرد ہوئی یعنی اس زمانے میں شاہ صاحب دکن ہی میں تھے، اور کچھ عرصہ کے بعد واپس تشریف لائے۔

شاہ صاحب کے تیسرے سفر دکن کا حال اُن کے ایک قصیدے سے معلوم ہوتا ہے جو اس طرح ہے:

"در مدح[5] راجہ راجگان مہاراجہ چندو لال بہادر مختار حیدرآباد

گو ہیں سپہر تیغ اور سنان شمس و ہلال و کہکشاں

پر ہیں ترے قبضے میں اب شمس و ہلال و کہکشاں"

چندو لال کو عہدۂ مدار المہامی ۱۲۴۳ھ میں حاصل ہوا[6]، البتہ ۱۲۴۵ھ

---

[1] شاہ صاحب کے لیے مشہور ہے کہ لکھنؤ دو بار گئے لیکن راقم سطور نے اپنے مضمون "شاہ نصیر لکھنؤ میں" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ لکھنؤ تین مرتبہ تشریف لے گئے اور ان تینوں سفروں کے زمانے کی دریافت کی بھی سعی کی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں نگار پاکستان نومبر ۱۹۶۲ء)

[2] شاداں لکھتے ہیں "۱۲۱۲ھ میں حسب تحریک مشیر الملک بہادر راجہ صاحب موصوف کو خطاب راجہ بہادر بارگاہ خسروی سے مرحمت ہوا" (دیباچہ دیوان شاداں مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۶)

[1] مجموعہ نغز مطبوعہ ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۸۵۔ [2] دیوان ذوق مرتبہ آزاد مطبوعہ ۱۹۳۳ء صفحہ ۶۔

[3] تلامذۂ غالب از مالک رام صفحہ ۲۳۳۔ [4] انتخاب کلیات شاہ نصیر مطبوعہ اعلیٰ پریس میرٹھ باہتمام حافظ محمد اکبر میرٹھی ۱۳۰۲ء

[5] "۱۲۴۵ھ میں راجہ راجایان کا خطاب پایا ... (۱۲۴۳ھ میں) راجۂ راجایاں مہاراجہ چندو لال بہادر وزارت عظمیٰ پر سرفراز فرمائے گئے، عہدۂ مدار المہامی پر فائز ہوئے"

(دیباچہ دیوان شاداں صفحہ ۶، ۷)

میں ان کو راجۂ راجایان کا خطاب مل چکا تھا اس لحاظ سے شاہ نصیر کا قصیدۂ مذکور ۱۲۴۵ھ کے بعد کا ہونا چاہیے اور یہی ان کے تیسرے سفر کا زمانہ ہو سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے چوتھا سفر وفات سے کچھ عرصہ پہلے اختیار کیا اس کا ذکر مولانا محمد حسین آزاد کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے:

"شاہ صاحب[1] چوتھی دفعہ پھر دکن گئے مگر اس دفعہ ایسے گئے کہ پھر نہ آئے۔ استاد مرحوم کہ شاہ صاحب کی استادی کو ہمیشہ زبان ادب سے یاد کرتے تھے اکثر افسوس سے کہا کرتے تھے کہ چوتھی مرتبہ ادھر کا قصد تھا جو سر راہ مجھ سے ملاقات ہو گئی میں نے کہا کہ اب آپ کا سن ایسے دور دراز سفر کے قابل نہیں، فرمایا میاں ابراہیم وہ بہشت ہے، بہشت میں جاتا ہوں چلو تم بھی چلو۔"

اس سلسلے میں سرسید لکھتے ہیں کہ:

"وہ تین بار حیدرآباد کو گئے[2] ... تیسری بار جس کہ خمیر ان کا وہیں کی خاک سے تھا شاہجہاں آباد کو آنا نصیب نہ ہوا اور اسی سرزمین میں وفات پا کر مدفون ہوئے۔"

جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہے شاہ صاحب نے چار سفر کئے سرسید کو شاید شمار میں کچھ غلطی ہوئی لیکن بہرحال کسی پانچویں سفر کی ہمیں اطلاع نہیں مل سکی ہے۔ اب ان سفروں کی روشنی میں آزاد کے مختلف بیانات کا جائزہ لینا بھی مناسب ہوگا:

"شاہ نصیر[3] مرحوم جب تیسری دفعہ دکن سے پھر کر آئے تو ایک مشاعرہ قائم ہوا اس میں یہی طرح تھی استاد نے یہ دو غزلہ پڑھا تھا جوانی کا عالم تھا اور شاعری بھی جوان تھی ... بر سر معرکہ واقفان حال موجود تھے انھوں نے مزے لئے۔

دانۂ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو"

ذوق کی اس غزل کے اشعار چمن بے نظیر (سنہ ۱۲۶۴ ہجری)، گلشن بے خار (مطبوعہ ۱۲۵۹ھ)، ایضاً مرتبہ ۱۲۴۸ تا ۱۲۵۰ ہجری (مطبوعہ ۱۲۵۳ھ) اور گلستان بے خزاں (۱۲۶۱ھ) وغیرہ میں موجود ہیں جس سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ ذوق نے یہ غزل ۱۲۴۸[4] سے پہلے کہی تھی، اسی زمین میں خوب چند ذکا کا ایک شعر تذکرہ سرور[5] میں بھی ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ مشاعرہ شاہ نصیر کے

[1] آب حیات ص۴۴۸۔ [2] تذکرہ اہل دہلی ص۱۲۳۔ [3] دیوان ذوق ص۱۳۹۔
[4] مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے تذکرہ سرور کا زمانہ تالیف ۱۲۱۶ سے ۱۲۲۹ھ تک لکھا ہے۔ (دیوان غالب نسخہ عرشی ص ۳۰۳) یہ تعین جن بنیادوں پر کیا گیا ہے ان کا مجھے علم نہیں ہے البتہ مطبوعہ نسخے میں عنوان کے مادہ تاریخ سے ۱۲۱۵ھ سال تالیف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شیخ پیر بخش سرور کے حالات سنہ بست وسہ جلوس اکبر شاہی لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ تذکرہ میں اضافہ کا سلسلہ ۱۲۴۴ ہجری تک جاری رہا، اس کے بعد کا حال معلوم نہیں۔

تیسری بار دکن جانے سے پہلے منعقد ہوا تھا، اس خیال کی تائید خود آزاد کے اس جملے سے ہوتی ہے:

"ایک[1] پرانی غزل شاہ نصیر کے مشاعرہ میں طرح ہوئی تھی

دانۂ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو"

آب حیات اور دیوان ذوق کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ آزاد نے عموماً ذوق کی ان ہی غزلوں کو پرانی کہا ہے جو ان کے نزدیک یا تو "دور تلمذ" کی ہیں یا ترک تلمذ کے کچھ بعد کی ہیں۔ بہرحال غزل مذکور شاہ صاحب کے تیسرے سفر سے واپسی کے بعد کی نہیں معلوم ہوتی، ممکن ہے کہ یہ معرکہ دوسرے سفر سے واپسی پر پیش آیا ہو، اس سلسلے کے ایک اور معرکے کا حال آزاد نے تفصیل سے درج کیا ہے:

"کئی برس[2] کے بعد شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا ... شیخ علاء الرحمٰن نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا مگر پہلے مولوی شاہ عبد العزیز صاحب کے پاس لے گئے ... اکثر اشعار پر سوال و جواب ہوئے ... اور جلسہ برخاست ہوا، اسی دن سے تکمیل علوم اور سیر کتب کا شغل واجب ہوا۔"

دکن سے دوسری مرتبہ کی واپسی پر ہی یہ دونوں معرکے ہو سکتے ہیں، شاہ صاحب کے پہلے سفر کے وقت تو ذوق نے شعر کہنا بھی شروع نہ کیا ہوگا۔

"ایک دن[3] فرمایا کہ یہ ہمارے بادشاہ کے پہلے سال جلوس کا قصیدہ ہے۔ شاہ نصیر مرحوم بھی دکن سے آئے ہوئے تھے، دل نے کہا کہ قصیدہ لکھئے اور ایسا لکھئے کہ استاد بھی کہیں کہ ہاں شاگرد نے کچھ لکھا، یہ طرح خدا نے دی اور خود سرانجام کیا اللہ اللہ ان دنوں کا جوش طبع بھی یاد رہے گا۔ عجب عالم تھا۔

ہے آج جو یوں خوش نما نور سحر رنگ شفق"

کہا جا چکا ہے کہ تیسرے سفر دکن کا زمانہ ۱۲۴۵ ہجری کے قریب کا ہونا چاہیے، قصیدۂ مذکور بہادر شاہ کی مدح میں ہے جو ۱۲۵۳ھ میں تخت نشین ہوئے تھے، اس طویل مدت کے گزر جانے کے بعد بھی "آئے ہوئے تھے" کہنا قرین قیاس نہیں، یہ فقرہ "تازہ وارد" کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ۱۲۵۴ھ میں شاہ صاحب دکن میں فوت ہوئے گویا اس وقت وہ یا تو دکن جا چکے ہوں گے یا جانے والے ہوں گے، واپس آنے والی حکایت مختلف وضعی ہے۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

[1] دیوان ذوق ص ۴۴۔ [2] دیوان ذوق ص ۱۲ تا ۱۴۔
[3] دیوان ذوق ص ۳۳۳۔

ہماری زبان

۱۵ مئی سنہ ۱۹۶۳ء

دُوسروں تک اپنی بات پہنچائیے اور اُنکی بات سے باخبر رہیئے

اُردو دوستوں کا اب تک عام دستور یہ رہا ہے کہ وہ اپنی بات اپنے حلقے میں کہتے ہیں، عام حلقوں تک نہیں پہنچاتے، دوسرے وہ عام حلقوں کی بات پر غور نہیں کرتے۔ مثلاً اگر کسی علاقے میں اُردو کے حقوق کو پامال کیا گیا ہے تو حکومت کو مطلع کرنے کے علاوہ اُردو کے اخبار ہی اس مسئلے کو اُٹھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُردو کے اخباروں کو تو اپنا فرض ادا ہی کرنا ہے، مگر یہ بات بھی بھولنا نہیں چاہیے کہ رائے عامہ کو اُردو سے زیادہ ہندی یا دوسری علاقائی زبانیں اور انگریزی کے اخبار متاثر کرتے ہیں اس لئے ہمارا یہ فرض بھی ہے کہ ہم اس علاقے کے انگریزی اخباروں یا اس علاقے کی سرکاری زبان میں نکلنے والے اخباروں کو بھی خطوط اور مضامین کے ذریعہ سے توجہ دلائیں۔ کبھی کبھار ان اخباروں میں اُردو کے متعلق خط یا مضمون شائع ہوتے ہیں اور ان میں ناواقفیت یا کسی کوتاہی کی وجہ سے اُردو کے سلسلے میں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جو کسی طرح حقیقت پر مبنی نہیں۔ مگر ان کا نوٹس نہ لیا گیا یا ان کی تردید نہ کی گئی تو ایسی بے سروپا باتیں عام ذہنوں میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اُردو کے اخباروں میں اُردو کے متعلق جو کچھ نکلتا ہے اُسے کسی طرح کافی نہیں سمجھنا چاہیے اور ان اخباروں میں بھی اپنے خیالات کی اشاعت کرنی چاہیے۔ مثلاً ہندوستان ٹائمس دہلی میں حال میں کسی نے اُردو کو ایک مردہ زبان کہہ دیا۔ دوسرے نے اتنی رعایت کی کہ اسے جاں بلب قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اُردو اخباروں کی تعداد، اُردو کتابوں کی روز افزوں اشاعت، اُردو بولنے والوں کی تین کروڑ کی تعداد کو نظر انداز کر کے ہی کوئی ایسی بے بنیاد بات کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح حال میں یہ اعلان ہوا کہ سہ لسانی فارمولا میں سنسکرت شامل نہ ہوگی اور نہ لازمی طور پر اس میں کوئی جنوبی ہند کی زبان رکھی جائے گی بلکہ مادری زبان یا سرکاری زبان کے علاوہ انگریزی اور کوئی سی جدید ہندوستانی زبان ہوگی جس میں اُردو بھی شامل ہے۔ اس کے فوراً بعد اجمیر کے پرنسپل مجیبن نے سنسکرت کی حمایت میں اسٹیٹس مین میں ایک خط لکھا جس کی تائید میں دوسرے خط بھی چھپے۔ اُتر پردیش کی سرکار ویسے ہی سنسکرت کو چھوڑنے پر رضامند نہیں معلوم ہوتی گو وہاں کے وزیر تعلیم نے دہلی کی کانفرنس میں یہ تسلیم کر لیا ہے کہ سنسکرت کو اس ذیل میں نہیں لانا چاہیے۔ اب ایسے لوگوں کی تائید کی وجہ سے ایک بڑے حلقے میں یہ خیال عام ہو گا کہ رائے عامہ سنسکرت کے حق میں ہے۔ اس لئے ایک طرف اُردو دوستوں کو اپنے اپنے دائرے میں حکومت کو توجہ دلانی چاہیے کہ ※

※ اُردو کے ساتھ انصاف کیا جائے، دوسرے اس علاقے کے انگریزی اور دوسری زبانوں کے اخباروں میں اپنے نقطۂ نظر کی اشاعت کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ بعض اوقات سیدھی سادی اور سچی باتوں پر عمل کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ دشواریاں ضرور ہوتی ہیں، مگر زیادہ تر ذہنی کاہلی، یا ذہنی کج روی کی وجہ سے لوگ ان دشواریوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اس لئے اُردو کے ہر اخبار کا یہ فرض ہے کہ وہ اُردو کے متعلق دوسری زبانوں کے اخباروں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مناسب تبصرے کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے لائے۔ جمہوریت میں بالآخر عوام کی رائے کی جیت ہوتی ہے اور عوام کی رائے کو موافق کرنے کے لئے، ان کے سامنے ہر اہم مسئلے کو صاف اور واضح طور پر بار بار لانا ہوتا ہے۔ یعنی اُردو کی مہم صرف اُردو میں نہیں انگریزی اور ہندی میں بھی چلانی چاہیے۔ کبھی دانستہ اکثر ترکستان ہو کر بھی جاتا ہے۔

سیر بین

ہنگامی حالات کی روشنی میں بہت سے قدم اُٹھائے گئے ہیں سونے پر کنٹرول ہوا ہے۔ لازمی طور پر روپیہ بچانے کا قانون بنا ہے۔ ہندوستان کے بچاؤ کے لئے ایک نیا ایکٹ نافذ ہوا ہے، مگر ایک چیز کی طرف حکومت اور عوام کی توجہ نہیں گئی۔ رفاہِ عام کی خاطر ہم سیر بین کے کالموں کے ذریعہ سے اس ضرورت کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔

ضرورت ہے ایک ایسے قانون کی جس کے ذریعہ سے تقریروں، افتتاحیہ جلسوں، صدارتی خطبات کو کنٹرول کیا جا سکے۔ اس قانون کا اطلاق خاص طور پر وزیروں اور لیڈروں پر ہونا چاہیئے لیکن حسب ضرورت سرکاری افسروں کو بھی اس کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے۔ اس کی رو سے وزیروں کو ہر جلسے کا افتتاح کرنے یا اُس کی صدارت کرنے کی کسی طرح اجازت نہیں ہونی چاہیئے، جو شعبہ اُن کے سپرد ہے اُس کے سلسلے میں کسی اجتماع کا وہ افتتاح کر سکتے ہیں اور اس کی صدارت بھی کر سکتے ہیں، مگر دوسرے شعبوں کے اجتماعوں کی ایک مقررہ تعداد کی پابندی ہونی چاہیئے۔ اسی طرح مشاعروں، کوی سمیلنوں، ادیبوں کی کانفرنسوں اور سائنس دانوں کے جلسوں کا افتتاح یا تو کوئی سائنس داں کرے یا ادیب، یا پھر وزیر تہذیبی امور۔ دوسرے کو اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ دعوتوں پر بھی پابندی لازمی ہے۔ صرف دوستوں کی دعوت میں شرکت جائز ہونی چاہیئے۔ اسی طرح وزیروں کے دورے بھی کم ہونے چاہئیں، یہ صرف اپنے شعبے کی ضروریات کے سلسلے میں ہوں۔

ہوتا ہو کہ ریلوے کے وزیر کو کسی مشاعرے کی صدارت کے لئے مدراس جانا پڑے اور آب پاشی کا وزیر مصنوعات کی نمائش کے افتتاح کے لئے تری وینڈرم پہنچے اور وہاں چند کلمے کہہ کر کارروائی کا آغاز کر دے۔

اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اب صرف لکھی ہوئی تقریریں پڑھی جائیں۔ خطابت کا زمانہ ویسے ہی ختم ہو گیا۔ آئندہ پنڈت مالویہ اور مولانا آزاد جیسے لوگ تو پیدا ہونے سے رہے۔ تقریر پہلے سے لکھی ہوئی ہو گی تو اس میں کچھ تو کام کی باتیں ہوں گی۔ بلند آواز سے سوچنا ہے تو یہ مظاہرہ مجمع عام کے بجائے تنہائی میں یا دوستوں کی بے تکلف صحبت میں ہو تو بہتر ہے۔

دیکھنا ہے اس قسم کا بل کب پارلیمنٹ میں آتا ہے ہمارے خیال میں تو اس نیک کام میں تاخیر نہ ہونی چاہئے۔

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کا جلسہ انتخاب

انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کی مجلس عاملہ کے عہدیداروں اور ممبروں کا انتخاب زیر صدارت پنڈت آنند نرائن ملا عمل میں آیا۔ انتخاب سے پہلے انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے انجمن کی دو سالہ کارگزاری کی رپورٹ پیش کی، جس میں حسب ذیل امور کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا۔

(۱) کرپلانی رپورٹ پر انجمن کی سب کمیٹی نے اپنی مفصل رپورٹ دے کر کرپلانی رپورٹ کو اردو کے لئے غیر مفید بتایا، یہ رپورٹ مجلس عاملہ کی متعدد نشستوں میں تفصیلی مباحثہ کے بعد منظور کی گئی۔

(۲) اردو تعلیم کا جائزہ اور داخلہ مہم۔ لکھنؤ میں جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ صرف پبلک اسکولوں میں ساٹھ فی صدی طلبہ اُردو تعلیم سے محروم رکھے گئے ہیں۔ مادری زبان کے اعلان ناموں کے فارم چھپوا کر سرپرستوں کو تقسیم کئے گئے اور طلبہ کا داخلہ کرایا گیا۔ لکھنؤ کارپوریشن کے کسی جونیر اسکول میں اردو کی تعلیم نہیں دی جاتی ہے۔

(۳) بیسک ریڈروں کی کمیابی اور تاخیر سے ملنے کے لئے محکمہ تعلیم کے ذمہ داروں کو پیش کیا گیا جس کی طرف محکمہ تعلیم نے توجہ دی اور فراہمی کتب کا انتظام کیا۔

(۴) رفاہ عام ایسوسی ایشن کے صدر پنڈت ہرکرن ناتھ مصر اور سکریٹری صلاح الدین عثمانی نیز ڈاکٹر فریدی صاحب کی عنایت سے انجمن کے دفتر کے لئے رفاہ عام بلڈنگ میں جگہ مل گئی، اور انجمن کا دفتر وہاں قائم کر دیا گیا۔

(۵) صوبائی انجمن کے جلسے کے لئے مقامی انجمن نے صورت دی اور جلسہ کی نذر ہو گئی۔ اس سلسلے میں ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ ڈاکٹر محمد حسین اس کے کنوینر ہوئے۔ امین سلونوی، سید امیر حسن نورانی، محمد حسن خاں عرشی، معصوم ناتھ سوم اور سکریٹری اس کمیٹی میں شریک تھے، اس کمیٹی نے فراہمی چندہ کی مہم کی اور کیپٹن وی، آر، موہن، سید حامد حسین مسلم، محمد ابوالقاسم خاں کی رہنمائی میں خاطر خواہ فنڈ جمع کر لیا۔

(۶) رپورٹ میں درخواست کی گئی کہ صوبائی انجمن جلد از جلد اپنا جلسہ طلب کر کے اُردو کے مسائل پر غور کر کے عملی قدم اٹھائے۔ خصوصاً سہ لسانی فارمولا پر جلد از جلد توجہ کرے۔

(۷) جنرل سکریٹری نے رپورٹ میں ممبران کی غیر حاضری اور اُردو سے غفلت پر اظہار افسوس کیا اور درخواست کی کہ انجمن کو متحرک اور زندہ رکھنے کے لئے، ہر ممبر اپنے اپنے ذمہ کوئی کام لے کم از کم اپنے اپنے حلقوں میں اُردو کے مسائل حل کرے، ممبر بنائے اور زیادہ سے زیادہ اُردو کے ہمدرد بنائے۔ ممبر سازی کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ میں کم از کم پانچ چھ ہزار ممبر ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اُردو اسکول، ایک دار المطالعہ، ایک اخبار کی سخت ضرورت ہے۔ سکریٹری نے یہ امید ظاہر کی کہ منتخب مجلس عاملہ ان سب مسائل کی طرف توجہ دے گی اور عملی قدم اٹھائیگی۔

رپورٹ میں سابق صدر انجمن ہیرا لال ورما ایڈوکیٹ کی موت پر اظہار افسوس کیا گیا اور ان کی خدمات کو سراہا گیا۔

سکریٹری نے انجمن کی مالی حالت کو ناقابل اطمینان بتایا۔

آخر میں انتخاب کی کارروائی شروع ہوئی۔ عہدیداروں کا انتخاب متفقہ طور پر عمل میں آیا اور مجلس عاملہ کے ممبران کا انتخاب بیلٹ پیپر کے ذریعہ سے ہوا، جس کے نتیجہ کا اعلان بعد میں کیا گیا۔ عہدہ داروں کے نام حسب ذیل ہیں:

صدر۔ پنڈت آنند نرائن ملا، نائب صدر۔ سید علی عباس حسینی صاحب محمد حسین خاں عرشی، جنرل سکریٹری۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، اسسٹنٹ سکریٹری۔ سید فدا حسین، بشیر حجازی، محمد یونس خالدی،

انجمن ترقی اُردو شاخ بودھن

انجمن ترقی اُردو شاخ بودھن مستقر شکر نگر ۱۰ مئی کو یوم ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب زور مرحوم منا رہی ہے جس میں حیدرآباد کے طالب رزاقی اور دیگر بیرونی شعراء شرکت فرما رہے ہیں۔ (ساغر حیدرآبادی معتمد)

کشمیر یونیورسٹی میں تعزیتی جلسہ

شعبۂ اُردو جموں و کشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام پوسٹ گریجویٹ شعبہ کے اساتذہ اور طلبہ کا ایک جلسہ اُردو کے مشہور طنز نگار ادیب شوکت تھانوی کے انتقال پر اظہار رنج کے لئے پروفیسر عبد القادر سروری صدر شعبۂ اُردو کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ قاضی غلام محمد صاحب لکچرار شعبۂ ریاضی نے شوکت تھانوی کے بارے میں مختصر تقریر کی اس کے بعد کرسی صدارت سے ایک تعزیتی تجویز پیش کی گئی جو حاضرین نے استادہ ہو کر سنی اور منظور کی۔ (ظہیر احمد حسین سکریٹری بزم ادب)

عادل منصوری

غم کا دریا

پورب پچھم اُتر دکھن
غم کا دریا بہتا جائے
گہرا نیلا اور گھمبیر
اک اک قطرہ اک اک تیر

آشا خوشیاں یادیں سپنے
اپنے ساتھ بہاتا جائے
ماضی حال اور مستقبل کے
سارے نقش مٹاتا جائے
تیری آنکھیں میرے خواب
سب کے سب ہیں زیر آب

پورب پچھم اُتر دکھن
غم کا دریا بہتا جائے
گہرا نیلا اور گھمبیر
اک اک قطرہ اک اک تیر

علی افسر حیدرآباد

انتباہ

گُزشتہ خوف اجل ہم نہ رہیں زیست کا غم
مُسکراتے ہوئے سہتے ہیں ہر اک دردِ الم
عزم کے ساتھ اُٹھاتے ہیں جدھر اپنے قدم
ڈھونڈ لیتے ہیں بھنور میں بھی کنارا ہم لوگ
آفتوں ہی کو بناتے ہیں سہارا ہم لوگ
ہم کو معلوم ہے انسان کی عظمت کیا ہے
ابن آدم کے لئے منزل رفعت کیا ہے
باہمی ربط و رواداری و الفت کیا ہے
دوستوں کے لئے اخلاص کا جوہر ہیں ہم
دشمنوں کے لئے خنجر کے برابر ہیں ہم
ہم کسی طرح کسی حال نہیں ہیں مجبور
اپنی طاقت پہ مگر پھر بھی نہیں ہیں مغرور
ہم کو ورثے میں ملا ہے حق و ناحق کا شعور
دینا آتا ہے ہمیں اینٹ کا پتھر سے جواب
کج نگاہوں کو دیا جائے گا خنجر سے جواب

نسیم سامانی

"اجنبی"

اجنبی تم نہ سپنوں میں آیا کرو
رات ڈھلتی ہے جب
ہر طرف چاندنی جال بنتی ہے جب
سج کے آتی ہے جب کہکشاں کی دلہن گنگناتی ہوئی
بنت مہتاب بھی لے کے انگڑائیاں گیت گاتی ہے جب
دور آکاش سے
اک سکوں در سکوں اک سکوت ازل
سیم گوں سیم گوں
لمحہ لمحہ زمیں پر برستا ہے
اوڑھ کر بام و در چاندنی کی ردا ظلمتِ شب پہ یوں جس طرح خندہ زن
جیسے گلشن میں اک نو دمیدہ کلی گل کی آغوش میں تھک کے سوئی ہوئی
جیسے پا جائے منزل مسافر کوئی
آگ دل میں لگاتا ہے ایسا سماں کچھ خبر ہے تمہیں اجنبی
اجنبی تم نہ سپنوں میں آیا کرو
رات ڈھلتی ہے جب
ہر طرف چاندنی جال بنتی ہے جب
گرمی راتوں میں آنکھیں ترستی ہیں جب
ایک پل کے لئے نیند آتی نہیں
آرزو اپنی منزل کو پاتی نہیں
چاندنی آ کے چھوتی ہے کومل بدن
جب پون کی طرح
گیت ڈھلتے ہیں جب قصرِ تخیل میں
یاد بن کے تری
ضو فشاں ضو فشاں
جیسے پھولوں کی مسکان میں ہو کے ضم رنگ لاتی ہے بادِ سحر کی نمی
جیسے شبنم کی بوندیں سرِ بیں منظر کیسے پڑتی ہے سورج کی پہلی کرن
بادۂ صبح گاہی چھلکتی ہے جب
اجنبی تم نہ سپنوں میں آیا کرو
رات ڈھلتی ہے جب
ہر طرف چاندنی جال بنتی ہے جب

سید حرمت الاکرام

غزل

زندہ رہنے کے چھن گئے انداز
ہم زباں تھا نہ ہم نوا کوئی
ڈھا گئی دل پہ آفتیں کتنی!
ناروا عشق میں ہے دانائی
جانے وہ ہیں کہ موت ہے حرمت

زندگانی میں اب نہ سوز نہ ساز
کون پہچانتا مری آواز
فکر انجام و کاوشِ آغاز
ورنہ روشن ہیں سب نشیب و فراز
دور سے آ رہی ہے اک آواز

جاوید حیدرآبادی

اُردو بولئے، اُردو پڑھئے، اُردو لکھئے

اس مضمون میں جن حقایق کی طرف اشارہ کیا
گیا ہے اُن پر ہم سب کی پوری توجہ
ہونی چاہیئے۔ (ادارہ)

"اُردو بولئے، اُردو پڑھئے، اُردو لکھئے" یہ وہ مشہور، مشترک، سہ نکاتی اور بامقصد نعرہ ہے جو حامیانِ اُردو کو اُردو کی طرف رجوع کرنے کے لئے اکثر و بیشتر روزناموں اور ماہناموں میں وقتاً فوقتاً بلند کیا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات خالی جگہ پُر کرنے کے لئے اخبارات یا رسائل اس نعرے کو معاون بنا لیتے ہیں، کیوں کہ اُردو کی بقا اور ترقی کا احساس ناظرین کو دلانے کے لئے اس سے اچھا نعرہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

اُردو بولئے: جہاں تک اس نعرے کا تعلق ہے، ہر اُردو بولنے والا یقیناً اُردو بولتا ہے اور بولتا رہے گا لیکن بعض دلدادگانِ اُردو ایسے بھی نظر آتے ہیں، جو بلا ضرورت اور خواہ مخواہ گفتگو کے دَوران میں انگریزی الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں، جس کے سبب اُن کی زبان نیم اُردو اور نیم انگریزی بن کر رہ جاتی ہے یا پھر اس پر اُردو اور انگریزی سے پیدا شدہ ایک مشترک زبان کا گمان ہونے لگتا ہے، نتیجتاً سننے والا اپنے ذہن نارسا کو صحیح نتیجے تک پہنچانے کی کوشش میں یہ سوچنے لگتا ہے کہ آخر اس قسم کی بولی بولنے والے حضرات کا مطمحِ نظر کیا ہوتا ہے؟ وہ اپنی علمی قابلیت کا اظہار کرنے کے لئے ایسی زبان استعمال کرتے ہیں یا زیادہ انگریزی داں ہونے کے باعث ان کے ذہن و دماغ میں بکثرت انگریزی الفاظ بسے ہوئے ہیں اور وہ اس کے متبادل اُردو الفاظ بر وقت استعمال کرنے سے قاصر ہیں، یا یہ کہ اُردو زبان پر طنز فرما رہے ہیں، یا پھر اُردو زبان اتنی تنگ داماں اور مفلس ہے کہ صحیح اظہارِ خیال کے لئے اُس کے پاس خاطر خواہ الفاظ نہیں ہیں، یا پھر یہ کہ ان کا ماحول اتنا انگریزی زدہ ہے کہ چار و ناچار، بے ارادہ اور بے ساختہ انگریزی الفاظ ان کی نوکِ زبان پر آجاتے ہیں۔ اس عبارت سے کوئی صاحب بخدا یہ مطلب نہ نکالیں کہ مضمون نگار تنگ نظر اور متعصب ہے جو انگریزی اور اس کے بولنے والوں سے نفرت کرتا ہے۔ انگریزی بلاشبہ ایک وسیع علمی اور ادبی زبان ہے جس میں بیش بہا، قابلِ قدر اور کثیر علوم و فنون کے خزانے موجود ہیں، جسے بین الاقوامی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے اور جس کی افادیت و اہمیت کا کوئی منکر ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن انگریزی کے ان الفاظ سے ہٹ کر جو اُردو میں جذب مستقل ہو چکے ہیں، دیگر الفاظ خلط ملط کرنا دراصل "اردو بولئے" کے پرچار پر ایک تازیانے سے کم نہیں ہے۔ جہاں تک مشاہدات کا تعلق ہے اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بیرونی ممالک کے سربراہ اور دوسرے مشہور و معروف افراد، دیگر زبانوں سے واقفیت کے باوجود، جب اپنے ملک کے باہر جاتے ہیں تو گفتگو، اظہارِ خیال یا تقریر اپنی زبان میں کرکے، اپنی زبان سے محبت و عقیدت کا ثبوت دیتے ہیں اور ان کے خیالات کی ترجمانی کے لئے مترجمین درمیانی کڑی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں بہ نظرِ انصاف غور فرمایئے کہ "اردو بولئے" کا مطالبہ کہاں تک حق بجانب ہے اور ہم کہاں تک اس پر عمل پیرا ہیں۔

اُردو پڑھئے: اس نعرے کی بے بسی اور بے چارگی بھی قابلِ دید ہے کیونکہ اکثر ذمہ داران بجائے اُردو برعکس عمل کرتے ہیں۔ آپ کو ایسے بہت سے حضرات ملیں گے جو اخبار بینی اور رسائل بینی کا ذوق و اشتیاق تو بے حد رکھتے ہیں لیکن اُردو اخبارات یا رسائل کا نہیں۔ وہ اس لئے نہیں کہ وہ اُردو سے نابلد ہیں یا اُردو ان کی مادری زبان نہیں ہے، بلکہ اس لئے کہ انگریزی اخبارات یا رسائل کے مطالعے سے بقول اُن حضرات کے، نہ صرف انگریزی قابلیت بڑھتی ہے بلکہ عام معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اردو اخبارات! توبہ کیجئے!! ان میں ہوتا ہی کیا ہے؟ مختصر خبریں جن میں سے اکثر باسی۔ معلوماتی مضامین اور جاندار تبصروں کا فقدان۔ سلجھے ہوئے سیر حاصل اداریوں کی کمی اور بے باک نگاری عنقا۔ صفحات کم تعداد میں شمارہ یا ایک آدھ جو نہ ہونے کے برابر۔ اس کے برعکس انگریزی اخبارات۔ مذکورہ بالا تمام خوبیوں اور صفات سے مزین۔ اُردو رسائل! خدا بچائے!! بجز تضیعِ اوقات کے کچھ بھی نہیں۔ چند بے ہنگم اور بے مقصد افسانوں، نظموں اور غزلوں کا پلندہ۔ مضامین اور اچھے مضامین دو فی صد سے بھی کم۔ اس کے برخلاف انگریزی رسائل۔ کیا کہنے۔ اعلیٰ وارفع سیاسی، معاشی، معاشرتی، نفسیاتی اور علمی مضامین کی دولت سے مالا مال۔ عمدہ اور دلچسپ کہانیوں سے بھرپور۔ پھر کاغذ اور طباعت کا تو جواب ہی نہیں۔ اُردو صدیوں میں بھی ان کی ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ لاکھ اٹل سہی لیکن قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ اگر اُردو داں طبقے میں اس قسم کی ذہنیت کے جراثیم پرورش پانے لگیں تو اُردو کیوں کر صحت مند و توانا رہ سکتی ہے؟ کس طرح پھل پھول سکتی ہے اور کس طرح ہم اس کی بقا و ترقی کا اہتمام کر سکتے ہیں؟ اردو اخبارات اور رسائل کی ترقی کی راہیں اس لئے محدود و مسدود ہوتی جاتی ہیں کہ اُردو داں خاطر خواہ ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے اور اشاعت کی کمی کی وجہ سے تو اکثر نئے اور اچھے پرچے اشاعت کے فوراً بعد ہی اپنی موت مر جاتے ہیں۔ جو جاری ہیں ان میں سے اکثر زندگی اور موت کی کشاکش میں مبتلا ہیں۔ اس صورتِ حال کی موجودگی میں اُردو جرائد اور رسائل کی بقا و ترقی کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں جب کہ "جن پہ تکیہ ہے وہی پتے ہوا دینے لگیں"؟

دیگر زبانوں کے رسائل و جرائد کی ترقی کا راز ان کے کثیر تعداد قارئین اور ان کی کثیرالاشاعتی میں مضمر ہے۔ ماسوا اس کے دیگر گوشوں پر نظر ڈالئے تو یہ واضح حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو میں تعلیمی سہولت کے باوجود بچوں کو انگریزی جماعتوں میں محض اس لئے داخل کرایا جاتا ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم سے کامیاب ہونے والے طالب علم کی قدر و قیمت ہی نہیں ہو سکتی اس کے لئے آئندہ راہیں مسدود ہو جائیں گی، جس کے نتیجے میں وہ اعلیٰ خدمت یا اچھی ملازمت کے نااہل ثابت ہوگا اور بعد میں نہ صرف اس فارغ التحصیل بلکہ اس کے سرپرستوں کو بھی پچھتانا پڑے گا۔ اردو میں کسی زبان یا فن کی کتابوں کا ترجمہ اس لئے بہت کم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اصل تصنیف ہی کا مطالعہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ تراجم میں مصنف کا اصل مفہوم یا حقیقی خیال فوت ہو جاتا ہے یا اچھے ڈھنگ سے پیش نہیں ہو سکتا۔ مثلاً شیکسپیر کے ڈرامے اگر اردو میں ترجمہ ہو کر شایع ہوتے ہیں تو پڑھنے والے اردو ترجمے کے مقابل انگریزی ڈرامے پڑھنے کو ترجیح اور فوقیت دیتے ہیں۔ نتیجتاً اردو میں طبع شدہ نسخے تباہ کر دینے کے قابل ہو کر رہ جاتے ہیں لہٰذا مترجم ترجمہ کرنے اور ناشر شایع کرنے کی جرأت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور کبھی بھولے سے بھی ایسی فاش غلطی یا حماقت کا مرتکب ہونے کی جسارت ہی نہیں کرتا یا کر سکتا۔

<u>اردو لکھئے</u>: یہ نعرہ بھی برعکس اور مختلف النوع اثرات کا حامل ہے۔ جب "اردو بولئے" اور "اردو پڑھئے" کا یہ حشر ہو تو اس کی مٹی بھی خراب ہی سمجھئے۔ محبان و مسازان اردو میں سے اکثر اردو کے بجائے انگریزی لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ خط اگر اردو میں لکھا جائے تو اس پر پتہ لازمی انگریزی میں لکھا جانا چاہیئے کیونکہ اردو اتنی محدود زبان ہے کہ جس خط پر اردو میں پتہ لکھا ہو وہ صحیح سلامت مرسل الیہ تک ارسال نہیں ہو سکتا۔ کسی محکمے میں یا کسی برسرِ اقتدار عہدہ دار کو اردو میں لکھی ہوئی درخواست نہیں بھیجی چاہیئے کیونکہ اردو میں تحریر کردہ درخواستیں ہیچ سمجھی جاتی ہیں اور قابلِ غور و شنوائی نہیں ہوتیں۔ ان کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے بلکہ ان سے کسی قسم کی پیش رفت کی توقع ہی محال ہے جس کے باعث کارروائی آگے بڑھنے کے بجائے داخل دفتر ہو کر رہ جاتی ہے۔ بعض اصحاب تو ایسے بھی ہیں جو اردو خطوط کا جواب انگریزی میں دینا ہی واجب تصور کرتے ہیں اور بہتوں نے اپنے نام اور پتے کے سرنامے اور لفافے تک صرف انگریزی ہی میں چھپوا رکھے ہیں ایسے بھی حضرات ملتے ہیں جو از راہ اردو نوازی خط تو اردو میں لکھتے ہیں لیکن اس پر اپنے دستخط انگریزی میں کرنا فرض لازم سمجھتے ہیں تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آسکے دور کیوں جایئے ایسے بہت سے اردو رسائل و جرائد ہیں، جن کے کارڈ، سرنامے، نام، نشان اور پتے تک اسی بین الاقوامی زبان یعنی انگریزی میں طبع شدہ ہوتے ہیں جن سے بیرونِ ملک بھی تشہیر کا کام لیا جا سکتا ہے۔ بعض فدایانِ اردو ایسے بھی ہیں جو کسی ایسے دارالمطالعے میں جاتے ہیں جہاں اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے اخبارات اور رسائل بھی آتے ہوں تو وہاں رکھے ہوئے رجسٹر میں اپنا نام انگریزی میں لکھتے یا دستخط انگریزی میں کرتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ منتظمانِ دارالمطالعہ اس خیال سے کہ اردو پڑھنے والے بہت کم آتے ہیں اردو پرچوں کی تعداد گھٹا کر دیگر زبانوں کے پرچوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

الغرض اس مضمون میں بیان کردہ حقائق معمولی نوعیت ہی کے سہی لیکن میرے خیال میں اردو کی بقا و ترقی کی راہ میں سنگ گراں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کاش سمجھے خدا کرے کوئی

آخر میں میری یہ دعا ہے کہ "اردو بولئے، اردو پڑھئے، اردو لکھئے" کا نعرہ جتنی شدت اور خلوص سے لگایا جاتا ہے۔ کاش! اس پر عمل بھی اتنی ہی شدت اور خلوص سے ہو۔

"اردو" زندہ باد۔ "اردو بولئے، اردو پڑھئے، اردو <u>لکھئے</u>" پائندہ باد۔

سید احتشام حسین

سہ لسانی فارمولا اور یو۔پی

غالباً چند دنوں کے اندر یو۔پی حکومت کی وزارت تعلیم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگی کہ اس ریاست میں اُردو کی کیا حیثیت ہوگی اور زبانوں کی تعلیم کے سلسلے میں جو کل ہند فیصلہ برسوں پہلے ہوا تھا اس پر کس نوعیت سے عمل درآمد کیا جائیگا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس فیصلے پر اُردو کی قسمت کا انحصار ہے اگر ابتدائی تعلیم میں اس ریاست میں جو اُردو کی مولد و منشا ہے اور جہاں آج بھی اسکو مادری زبان ماننے والوں کی سب سے بڑی آبادی ہے اُردو کی تعلیم کے لئے معقول جگہ نکلتی ہے تو انصاف اور جمہوریت پسندی کا احساس ہوگا ورنہ یہ سمجھا جائیگا کہ صرف اُردو کو مٹانے کے لئے اس کے مقابلے میں ایسی دوسری زبان کو جگہ دی جارہی ہے جس کو عملی حیثیت سے آج کے سماجی ارتقا میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہے۔

یہ بات ہر شخص کے حافظے میں ہوگی کہ جس وقت تعلیم کا سہ لسانی فارمولا بڑی بحث و تمحیص کے بعد منظور کیا گیا تھا اس میں یہ بات واضح تھی کہ ان ریاستوں میں جن کی سرکاری زبان ہندی ہے، انگریزی اور ہندی کے علاوہ ہندستان کی کوئی تیسری "جدید زبان" نصاب میں داخل کی جائیگی ہمارے محبوب رہنما پنڈت نہرو نے بھی بار بار اسی کا اعادہ کیا اور یہ بات عقل میں بھی آتی تھی کہ جس علاقہ میں جس جدید زبان کے بولنے والوں کی اکثریت ہوگی یا جس زبان کو سماجی اور تہذیبی اہمیت حاصل ہوگی یا جس کے جاننے سے ریاست کے عاملوں اور کارکنوں کو اپنے کام میں سہولت ہوگی اور قومی تعمیر کا کام آسان ہوگا اس زبان کو نصاب میں جگہ دی جائے گی لیکن حیرت اس وقت ہوئی جب حکومت اتر پردیش نے کل ہند منصوبہ میں یہ غیر معمولی تبدیلی کر دی کہ "جدید ہندستانی زبان" کو محض "ہندستانی زبان" میں بدل کر دیا تاکہ اس میں سنسکرت کے لئے جگہ نکل آئے بے شک سنسکرت ایک عظیم الشان زبان ہے اس میں فلسفہ، ادب، مذہبیات کے بیش بہا خزانے موجود ہیں اور جو بھی اس کا مطالعہ کرے گا وہ قدیم علوم کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کریگا۔ لیکن اس زبان کے ذریعہ سے جدید مسائل کو حل کرنا، موجودہ زندگی کو سمجھنا اور قومی تعمیر میں حصہ لینا ناممکن ہے۔ زندگی تیز رفتار ہے اور ہر لمحے آگے بڑھنے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ملک کے چاروں طرف دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں، اس وقت سب سے بڑی قومی ضرورت یہ ہے کہ جو نسل تیار ہو وہ قومی مسائل کو اچھی طرح اور آسانی سے سمجھ سکے، تیزی سے ان پر عمل کر سکے اور ملک کی ترقی میں معین ہو۔ یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب تعلیم انسانوں کی فطری صلاحیتوں کو بہتر کرے۔ ہمارے ارباب حل و عقد اور قومی رہنماؤں کو ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ کیا یہ ضرورت سنسکرت سے پوری ہو سکتی ہے؟ ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت تک ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ جو سنسکرت کو مضمون کی حیثیت سے لے کر کامیابی حاصل کرتے ہیں، نہ تو سنسکرت سمجھ سکتے ہیں، نہ بول سکتے ہیں، نہ لکھ سکتے ہیں اور نہ سنسکرت اور جدید زبانوں کے لسانی رشتے سے واقف ہوتے ہیں بلکہ ہے کہ اس سے کسی خاص قسم کے تہذیبی یا مذہبی جذبے کی آسودگی ہو جاتی ہو لیکن ذہنی افق وسیع نہیں ہوتا۔

میں یہ بات پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سنسکرت ایک بڑی عظیم المرتبت زبان ہے اور اس سے فی نفسہٖ کسی کو مخالفت نہیں ہے تھوڑی سی سنسکرت تو یو۔پی کے اسکولوں میں چھٹے درجے ہی سے پڑھائی جانے لگی؟ اس کی مخالفت عام طور سے کبھی نہیں کی گئی لیکن اگر کسی مخصوص گروہ، طبقے، خطے یا تہذیبی اقلیت کو اسکی مادری زبان سے محروم کر کے سنسکرت پڑھنے پر مجبور کیا گیا تو یہ نہ صرف سماجی انصاف، جمہوری تقاضے اور قومی مفاد کے خلاف ہوگا بلکہ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی غلط اور گمراہ کن ہوگا۔

یو۔پی کی حکومت کی نیت تو اس سے واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے کچھ دنوں تک اس بات کو بالکل پوشیدہ رکھا کہ وہ تعلیم کے لئے کن تین زبانوں کا انتخاب کرے گی۔ سوالوں کا جواب مبہم دیا گیا اور درخواستیں بے نیاز جواب رہیں پھر آہستہ آہستہ بات کھلنے لگی اور معلوم ہوا کہ یو۔پی کے اسکولوں میں صرف ہندی انگریزی اور سنسکرت کا انتظام ہوگا۔ حکومت نے نہ اقرار کیا نہ انکار۔ جب لوگوں نے کچھ شور مچایا تو کہا گیا کہ اُردو کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ اور بنگالی، تامل، تیلگو کا بھی لیکن اس کے معنی یہ تھے کہ اسکول آزاد ہوں گے جس کا انتظام چاہیں گے کریں گے۔ امدادی اور پرائیوٹ اسکولوں پر حکومت کوئی دباؤ نہیں ڈالے گی اور اپنے ماتحت سرکاری اسکولوں میں بھی ایک آدھ جگہ انتظام کر دے گی۔ جنوبی ہند کی زبانیں سیکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کرے گی اور وظائف بھی دے گی۔

کچھ خوش عقیدہ لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اُردو کے لئے زمین ہموار ہو گئی ہے جب اُردو ابتدائی درجوں میں پڑھائی جائے گی اور کم سے کم کچھ لوگ اسے لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھیں گے تو اعلیٰ تعلیم تک اس کا سلسلہ جاری ہو جائے گا اور جب اچھی خاصی تعداد میں لوگ اُردو جانیں گے تو مقابلے کے امتحانوں میں بھی اسے اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن یہ سب کچھ خوش خیالی سے زیادہ نہ تھا۔ حکومت کے اہم ارباب اختیار نے خود یہ خیال ظاہر کیا کہ حکومت تو تیسری زبان کی حیثیت سے سنسکرت ہی پڑھانا چاہتی ہے لیکن اُردو کا مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے، اگر حکومت کو اُردو کا انتظام کرنا پڑا تو تعلیم کے بجٹ پر بہت بوجھ پڑ جائے گا۔ مقصد یہ تھا کہ سنسکرت کے پڑھانے والے تو ہر اسکول میں موجود ہی ہیں، اُردو پڑھانے والوں کے لئے انتظام کرنا پڑے گا۔ (اگرچہ کئی سال سے مسلسل اُردو پڑھانے والوں کی تخفیف ہو رہی ہے لیکن اب بھی تقریباً ہر اسکول میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ابتدائی درجوں میں اُردو پڑھا سکتے ہیں)، اس طرح حکومت کو بڑی دشواری کا سامنا ہوگا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو حکومتیں ہمیشہ ان کاموں کے سلسلے میں کہتی رہتی ہیں جنھیں کرنا نہیں چاہتیں۔ غرض کہ کوئی بات

واضح نہ تھی لیکن ابھی دوسری مئی کو مسز نیو چلوردی کے سوال کے جواب میں ڈاکٹر شرما جی نے جو کچھ کہا اس سے اُردو والوں کے سامنے صحیح صورت حال پیش ہو گئی۔ مرکزی وزیر تعلیم نے کہا کہ یو پی کی حکومت نے تو تیسری زبان کی حیثیت سے سنسکرت ہی پڑھانا طے کیا ہے، ہم نے اس سے درخواست کی ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ہر تعلیمی ادارے میں کوئی جدید ہندستانی زبان پڑھانے کا انتظام کرے چنانچہ اس نے بعض حلقوں میں انتظام کیا ہے۔

اس سے کم از کم یہ نتائج تو ضرور ہی نکل آتے ہیں کہ (۱) حکومت یو پی در اصل سنسکرت ہی پڑھانا چاہتی ہے۔ (۲) اس معاملے میں وہ کل ہند فیصلہ یا مرکزی حکومت کی خواہش پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔ (۳) وہ تعلیم کے معاملے کو کل ہند مفاد اور مسئلہ کی روشنی میں نہیں رکھنا چاہتی۔ (۴) وہ اُردو کو جو اتر پردیش کی دوسری زبان ہے، کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتی۔ (۵) وہ سنسکرت کو جو محض ایک کلاسکی زبان کی حیثیت سے پڑھی جاتی ہے، جدید زبان کی جگہ دے کر ان تمام لوگوں پر لادنا چاہتی ہے، جو اس کا پڑھنا ضروری نہیں سمجھتے کیوں کہ اس کے پڑھنے کی وجہ سے انھیں اپنی مادری زبان کی تعلیم سے محروم ہونا پڑے گا۔ (۶) تھوڑے دنوں میں اردو کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، پڑھنے والوں کی تعداد گھٹ جائے گی، اعلیٰ تعلیم کے لئے اس کے سوتے خشک ہو جائیں گے، اس کے پڑھانے والوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، مختصر یہ کہ اسے زندگی میں کوئی جگہ نہیں دی جائے گی۔ (۷) یو پی کے بعض خطوں کے بعض اسکولوں میں اس کے پڑھانے کا انتظام کر کے اردو والوں کی اشک شوئی کر دی جائے گی حالانکہ عملاً اس میں بڑی دشواریاں پیدا ہوں گی مثلاً جو بچے ان علاقوں میں اُردو پڑھ رہے ہیں، اگر ان کے والدین کا تبادلہ ان اضلاع میں ہو گا جہاں اُردو کا انتظام نہیں ہے تو وہاں کیا صورت ہو گی! (۸) جدید زبانوں میں کون کون سی زبانیں یو پی کے لئے مناسب سمجھی جائیں گی، یہ ابھی تک واضح نہیں۔

میں تو ذاتی طور پر اس خیال کا ہوں کہ تعلیم کا نہج کچھ ایسا ہونا چاہئے جس میں طالب علم زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھ سکیں اور مادری زبان کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ موجودہ صورت حال میں اس ریاست میں اُردو کی حد تک مادری زبان ہی سب سے زیادہ خطرے میں ہے۔ جولائی سے نیا تعلیمی سال شروع ہو گا، اس وقت تک یو پی کی حکومت کو کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی ہو گا۔ ہمیں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ ہم دیکھیں اس کا فیصلہ کیا ہوتا ہے بلکہ وہ سارے ذرائع استعمال کرنا چاہییں جن سے اُردو کو پوری ریاست میں تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھایا جا سکے۔ ہمیں اعتراض نہ ہو گا اگر تامل، تلگو، بنگالی وغیرہ کا بھی انتظام مخصوص اسکولوں میں کر دیا جائے۔

اُردو سے محبت کرنے والوں، انصاف اور جمہوریت سے محبت کرنے والوں کو اس نازک موقع پر اپنی آواز اُٹھانا چاہئے۔ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں ہے۔

(بشکریہ قومی آواز)

بقیہ

شاہ نصیر کی دکن سے واپسی

شاہ نصیر نے عہد اکبر شاہی میں دہلی میں بھی کافی وقت گزارا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں مدح شاہ دہلی میں بھی قصائد اور مرزا سلیم کی شادی کے موقع کا ایک قصیدہ ملتا ہے۔ ان کا ایک قصیدہ "اکبر شاہ بادشاہ غازی" کی مدح میں بھی ملتا ہے۔

دکھلادوں ابھی کر کے گل باغ سخن کی شاخ
ہو دے قلم گلاب کٹے نسترن کی شاخ

اس زمین میں ذوق کا بھی ایک قصیدہ اکبر شاہ کی مدح میں ہے جس کے متعلق آزاد نے ایک حکایت درج کی ہے:

"شہیدی[1] مرحوم بلباس فقیری دلی میں آئے... ناسخ کی بہت تعریف کی اور "شاخ" کی غزل پڑھ کر کہا کہ اس غزل پر آج کون قلم اٹھا سکتا ہے... استاد نے غزل کہی۔"

یہ حکایت بھی فرضی ہی معلوم ہوتی ہے، شہیدی شاہ نصیر کے شاگرد تھے، لیکن تعجب ہے کہ اس حکایت میں انھوں نے حفیظ، ناسخ اور ذوق کو شیخ وقت مانا اور شاہ نصیر کا ذکر نہ کیا۔ حالانکہ اسی زمین میں شاہ نصیر کا قصیدہ بھی موجود ہے، صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نصیر اور ذوق دونوں نے ناسخ کی غزل پر قصیدہ لکھا تھا اور یہ بات تسلیم شدہ بھی ہے کہ یہ لوگ ناسخ کے اشعار پر اشعار کہا کرتے تھے، شہیدی کا نام لے کر یہ حکایت وضع کرنا محض استاد پرستی کا سبب معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] شاہ نصیر دہلوی از سعادت مرزا ص ۴۳ ۔
[2] دیوان ذوق ص ۹۸ تا ۹۹ ۔

آج کی جنگ فقط تیر و تبر کی تو نہیں
آج کی جنگ فقط تیغ و سپر کی تو نہیں
وہی خامہ جو گل افشاں بھی ہوا کرتا ہے
کبھی خنجر کبھی پیکاں بھی ہوا کرتا ہے

(داعی اعظمی)

معاصر

سہ لسانی فارمولا میں سنسکرت

سہ لسانی فارمولے کے تیار کرنے والے اس فارمولے میں ہندوستانی زبانوں کے خانے میں صرف ان ہی زبانوں کو رکھنا چاہتے ہیں جو گفتگو اور تحریر میں عام طور سے استعمال ہوتی ہیں یعنی جن کو لسانی اصطلاح میں زندہ زبان یا ماڈرن زبان کہا جاتا ہے۔ لیکن اتر پردیش کی حکومت ان کے فیصلے کو نہ ماننے اور سنسکرت کو اس میں شامل کرنے پر مصر ہے جبکہ ڈاکٹر شریمالی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے لوک سبھا میں رنبیر چکرورتی کے سوال کے جواب میں دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندی ریاستوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اسکولوں میں ہندوستان کی ماڈرن زبانوں میں سے کسی ایک کو تیسری زبان اور حیثیت سے پڑھائے جانے کا بندوبست کریں۔ پھر انہوں نے کہا کہ "اتر پردیش اور بعض دوسری ہندی ریاستوں نے سنسکرت کو تیسری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے لیکن ان ریاستوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ہندوستان کی ماڈرن زبانوں میں سے کسی ایک کو اپنے اسکولوں میں پڑھائے جانے کا بندوبست کر دیں۔ اتر پردیش نے بعض اسکولوں میں ایک ماڈرن زبان کے پڑھائے جانے کا بندوبست کر دیا ہے۔" اس بیان سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اتر پردیش نے تیسری زبان کی جگہ سنسکرت کو دے دی ہے اور وہ یہ جگہ سنسکرت کو ہٹا کر کسی ماڈرن زبان کو دینے میں تکلف کر رہا ہے۔

سنسکرت بہت اہم زبان ہے اور ہندوستان کی قدیم تاریخ اور فلسفے کی کان ہے اور اس کے پڑھنے سے بہت سے طالب علموں کو کافی فائدہ ہوگا لیکن ان خوبیوں کے باوجود سنسکرت وہ کام نہیں دے سکتی ہے جو ہندوستان کی ماڈرن زبان دے سکتی ہے۔

سہ لسانی فارمولا کی غرض یہ ہے کہ ہندوستان میں یک جہتی پیدا ہو۔ اور یہ چیز سنسکرت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی لسانی بناوٹ کچھ ایسی ہے کہ یہاں بارہ تیرہ زبانیں بڑے پیمانے پر بولی جاتی ہیں اور ایک زبان کے عام بولنے والے دوسری زبان والوں سے بات چیت کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ دو مختلف زبانوں کے بولنے والوں کا ایک دوسرے سے سابقہ صرف اسی وقت نہیں پڑتا ہے جب وہ ایک دوسرے کے لسانی علاقے میں جائیں، بلکہ خود اپنی ریاست میں بھی پڑ جاتا ہے، کیونکہ ہندوستان کی ہر ریاست میں دوسری زبانوں کے بولنے والے کافی تعداد میں بستے ہیں اور یہ ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کرنے اور ایک دوسرے کے اخبار اور کتابیں پڑھنے سے محروم رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ایک دوسرے سے قریب آنا ناممکن سا ہو گیا ہے۔ اور پاس رہنے کے باوجود اجنبی رہتے ہیں یہ دوری اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب شمالی ہند اور جنوبی ہند کا سوال اٹھتا ہے کیونکہ وہاں لسانی دوری نے طرح طرح کی دوریوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ان ہی دوریوں کو دور کرنے کے لیے سہ لسانی فارمولا بنایا گیا تھا۔ اس کی غرض صرف یہ نہ تھی کہ بچے تین زبانیں سیکھ لیں بلکہ غرض جو ہے وہ اس سے کہیں دور تک جاتی ہے۔

سنسکرت کو اگر سہ لسانی فارمولے میں داخل کر دیا گیا تو اس سے مذکورہ غرض تو پوری ہونے سے رہی۔ کیونکہ سنسکرت سیکھ لینے کے بعد بھی اپنی ریاست میں دوسری زبانوں کے بولنے والے جو لوگ رہتے ہیں، وہ بدستور دور رہیں گے۔ ہندوستان کی ریاستوں کا لسانی فاصلہ بدستور رہے گا اور جنوبی ہند اور شمالی ہند کی دوریوں میں کسی قسم کی کمی نہیں آئے گی اس لئے ہندوستان کے بہی خواہوں کو اتر پردیش کی سنسکرت کی بے جا حمایت کے خلاف آواز اٹھانا چاہیے۔

ایک قدرتی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سہ لسانی فارمولا میں اردو کو جگہ دی گئی ہے یا نہیں۔ اور دی گئی ہے تو دیکھنا ہے کہ کیسی جگہ دی گئی ہے یا وہ جگہ دی گئی ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ آج بھی جیسا کہ پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اپنے مراسلے میں کہا ہے بہت سے اسکول ایسے ہیں جہاں ایسے ٹیچر موجود ہیں جو اردو بھی پڑھا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کچھ طالب سہ لسانی فارمولے کے ماتحت اردو لیں گے تو حکومت پر کوئی انتظامی بار نہ پڑے گا اور نہ اس کی مالی دشواریوں میں اضافہ ہوگا۔ دوسری طرف اس سے ریاست میں قومی یک جہتی کے احساس میں اس اقدام سے بہت اضافہ ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں مناسب یہی ہے کہ جس اسکول میں بھی اردو پڑھانے والا ٹیچر موجود ہے وہاں تو اسی سال سے اردو کو سہ لسانی فارمولے کے ماتحت لینے کی اجازت دے دی جائے۔ چیز تو ایسی ہے جس کے لئے "موجودہ غیر معمولی حالات" کے حدود کے اندر رہ کر جو کوشش بھی ممکن ہو کرنا چاہیے کم سے کم فوری طور پر انگریزی، ہندی اور اردو اخباروں میں اس مسئلہ کا اتنا تذکرہ ضرور ہونا چاہیے کہ حکومت کو یہ محسوس ہو کہ لوگوں نے لسانی فارمولے کے بارے میں اس کی ترجمانی کو خاموشی سے تسلیم کر لیا ہے اس کے بعد جدوجہد کا ایک نقشہ بنا کر اسے چلایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو غیر ہندی ریاستوں کی بھی ہمدردیاں حاصل کی جائیں اور پھر آگے چل کر اس حلقے کو ہر سال بڑھایا جائے۔

اردو دوستوں کے نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ بے حد اہم ہے۔ اور ہم کو یقین ہے کہ ہندی والے اس ہمدردی میں بخل نہ کریں گے اور ان کو بھی یہ احساس ہوگا کہ سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کرنا ایک طرح کی زبردستی ہے، اور اسی طرح اردو کو اس میں مناسب جگہ نہ دینا بھی بہت بے جا بات ہے۔ اس طرح کی کوشش اگر ایک عرصے تک جاری رہی تو ضرور فائدہ ہوگا۔

(قومی آواز)

مراسلہ

اُردو ٹائپ

اُردو طرزِ تحریر بہت ہی آسان اور مختصر بھی ہے۔ ایک مدت ہوئی ہم نے اس سلسلے میں ایک بنیادی کتاب "اُردو تعلیم کا آسان قاعدہ" بھی مرتب کیا تھا، جس میں وہ جملہ خصائص اور طریقے اور وہ تمام اصول اور ضابطے تحریر کئے گئے تھے، جن کے معمولی طور پر ذہن نشین کرلینے سے اُردو، فارسی، عربی الفاظ و حروف کی تحریر و قرأت بہت کچھ آسان ہوجا سکتی تھی۔ اور اس سلسلے میں ایک بنیادی اور اصولی جدید آسان قاعدہ پیش نظر تھا، جس میں ابتدائی دلا علم ذہن و حافظے کو گوناگوں اور طویل الفہرست و مختلف الاشکال حروف کے پھیلاؤ میں بکھیرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ چند خاص آسان اور مفید ضوابط کے ماتحت و پیش نظر یہ مسئلہ نہایت آسانی سے حل ہوجاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ انضباط و تحریر کے ساتھ ہی فوراً کچھ ایسے حالات و حوادث پیش آتے رہے کہ یہ کل مُفید مسودہ پڑا رہ گیا اور پھر اس کی طباعت و اشاعت کا بالکل موقع نہ ملا۔

انھیں ضوابط و اصول کے پیش نظر، ہم نے سلسلۂ اسلامی انسائیکلو پیڈیا (ترجمۂ دائرۃ المعارف الاسلامیہ) کی ۲ جلد۲ کی طباعت کے لئے صرف ۸۰ ٹکروں میں نسخ ٹائپ تیار کیا تھا، جو اپنے ٹکروں کی کمی کے لحاظ سے ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا تھا (اور جس کا ایک نہایت ہی مختصر مطبوعہ نمونہ بھی اس خط کے ساتھ، سرسری طور پر ارسالِ خدمت ہے ملاحظہ فرمائیے)، مگر افسوس کہ جدید انقلابات کے بعد، پے در پے کچھ ایسے مسلسل تشویشناک اور پریشان کُن حالات و حوادث اور زلازل و طلاطم پیش آتے رہے کہ پھر مزید اقدام عمل کا بالکل موقع نہ ملا۔ جس کے لئے سکنڈ جرمنی وار کے بعد کاغذ کی فراہمی بھی مشکل اور غیر ممکن ہو گئی۔ اور پھر یہ سارا کا سارا پروگرام یونہی پڑا رہ گیا ہے۔ بہرکیف یہ ایک مسلّمہ مسئلہ ہے کہ کسی زبان کی نشر و اشاعت اور اس کی طباعت کی حقیقی ترقی و کامیابی کے لئے ٹائپ کا رواج بہت ضروری ہے۔ مگر افسوس کہ اُردو طباعت اور نشر و اشاعت، لیتھو طرزِ طباعت کی وجہ سے اب تک بہت پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ رہی جیسا کہ معلوم ہے:

ایک تو اردو ٹائپ میں اجزا اور ٹکروں کی کثرت، اور دوسری سب سے بڑی وجہ یہ کہ اُردو پڑھنے والوں میں نستعلیق خط کا ایسا عام رواج ہو گیا ہے اور اس کی ایسی انتہائی مقبولیت پیوست ہو چکی ہے کہ اس کے مقابلے میں قدیم (کلکتیہ) پر نسخ ٹائپ کا رواج تو کجا، اچھے نسخ ٹائپ کی بھی نہ چل سکی۔ اس کی مقبولیت نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف وقتوں میں اُردو طباعت کے لئے ہندوستان کے اہم ترین اداروں کی جانب سے نسخ ٹائپ کو رواج دینے کی پوری کوشش بھی کی گئی؛ مگر کامیابی نہ ہوئی۔

دراصل سب سے پہلے، ضرورت تھی کہ اُردو طباعت کے لئے نستعلیق ہی خط میں ایسا مناسب و موزوں ٹائپ تیار کیا جائے، جو نستعلیق طرزِ تحریر سے بہت زیادہ مطابقت رکھتا ہو۔ اور ساتھ ہی اس میں حروف کے ٹکڑے اور جوڑوں کے اجزا بھی بہت ہی کم ہوں۔ جب تک اُردو ٹائپ کو نستعلیق خط سے کافی مناسبت نہ ہو گی اور اس کے جوڑوں کے ٹکڑے موزوں حد تک کم نہ ہوں گے، اس کی مقبولیت اور رواج و کامیابی غیر ممکن اور موہوم تخیل ہے ——— کافی غور و خوض کے بعد، اس سلسلے میں ہم نے وہ آسان اصول اور ضابطے مکمل کر لئے ہیں جن کے ماتحت؛ پوری کامیابی کے ساتھ اردو نستعلیق ٹائپ کی تیاری و تکمیل، تقریباً ۸۲ ٹکڑوں میں ممکن ہے؛ جس میں ان مذکورہ خوبیوں کے علاوہ ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہوگی کہ ٹائپوں کی بہت تھوڑی تعداد اور اس کے کم وزن سے بھی، زیادہ ٹائپوں کا کام اور مصرف لیا جا سکے گا۔ بعض جگہ صرف ایک ایک جوڑ اور ایک ایک ٹکڑے سے پانچ پانچ اور سات سات حروف کا کام بآسانی لے سکیں گے۔ ورنہ ایک حرف اور ایک ٹکڑے سے دو حروف اور دو ٹکڑوں کا کام تو عموماً لیا جا سکے گا۔ اس طرح ۸۰ یا ۸۲ ٹکڑوں سے ۱۵۰ ٹکڑوں کا کام لیا جا سکے گا۔ میری پختہ رائے ہے کہ پہلے پہل کتابوں کی طباعت کے لئے اوسط درجے کے کتابی حروف کے نستعلیق ٹائپ تیار کئے جائیں اور پھر اس کے بعد حسب ضرورت باریک اخباری حروف اور دوسرے دوسرے سائز کے ٹائپ بھی تیار کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح آسانی سے زیادہ کامیاب اور زیادہ مستحکم اقدام عمل ممکن ہوگا۔ ہر سائز کا ٹائپ، پہلی پہلی مرتبہ، دو مہینے کے اندر تیار کر کے دے سکوں گا، کیونکہ پہلی دفعہ سانچے کی تیاری میں دیر ہو گی۔ لیکن پھر بعد میں وہی ٹائپ ایک ہفتے کے اندر ہی مہیا کیا جا سکے گا۔

(محمد عبد المغیث نیموی

تبصرے

ڈاکٹر محمد حسن

سنجوگ

از رابندر ناتھ ٹیگور، ترجمہ رضا مظہری۔
مطبوعہ ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی۔
ضخامت ۴۰۵ صفحات۔ قیمت سات روپے۔

یہ رابندر ناتھ ٹیگور کے ناول کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ شستہ اور
...واں ہے۔ اسے پوری طرح اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً اس
...م کے طویل اور اُلجھے ہوئے جملے کہیں کہیں مل جاتے ہیں:
"...نئی دلہن کی ترک کردہ خوابگاہ میں بیکار اور ناوقت اور وہ بھی اکیلے وقت برباد
...اُن کی ذلت سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے وہ غصہ میں تن بھن کرتا باہر چلا گیا تھا۔"

...ہر ترجمے کے اپنے لسانی مطالبات ہوتے ہیں اور مترجم کی کامیابی یہی
...کہانی، موقع محل، کردار اور فضا کے مطابق سادہ، مرصع، گنوارو یا نفیس
...الفاظ و محاورات استعمال کرے۔ رضا مظہری صاحب بنگالی سے واقف ہیں
...لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ شاید براہ راست بنگالی سے کیا ہوگا مگر ترجمے
...بنگالی ادب کا روپ رنگ اور وہاں کی سرزمین کا نکھار نہیں آیا ہے جو ٹیگور کی خاص
...چھپنے تمام ترجم سے قبل اگر ایک تفصیلی پیش لفظ بھی ہوتا اردو داں طبقوں کے لیے مفید ہوگا۔

اردو ناول کی تنقیدی تاریخ

از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔
ناشر ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ۔
ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی کتاب ان کے بیان کے مطابق ۱۹۵۱ء
...پاکستان میں چھپی تھی اب ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے اس کا ہندوستانی ایڈیشن شائع
...مصنف کی کئی رایوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر بلاشبہ یہ کتاب نئے تنقیدی
...میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو ناول کا تکنیک اور مضمون
...حیثیتوں سے تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ کتاب تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے پہلے
...تمہید قرار دیا گیا ہے دوسرے میں ابتدائی دور سے بحث کی گئی ہے جو ۱۸۰۰ء سے
...شروع ہو کر ۱۹۰۵ء پر ختم ہوتا ہے یہی دور اردو ناول کا عہد زریں قرار دیا گیا ہے
...مصنف نے مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا ہی کو اردو کا "سب سے پہلا پورا ناول"
...دیا ہے اور امراؤ جان ادا کو فنی نقطۂ نظر سے "اردو کا پہلا بڑا کردار" بتایا ہے جس کی
...ذات واضح، پیچیدگی مسلم اور انفرادیت صاف" ہے۔ تیسرے دور کو مصنف نے اردو
...ناول کا دور انحطاط قرار دیا ہے یہ دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۶۲ء تک قائم کیا گیا ہے
...اس میں پریم چند کی ناول نگاری کا بھی ذکر آیا ہے مصنف نے اس سے یہی نتیجہ نکالا ہے
...اردو ناول اپنے ارتقا کی ایک منزل پوری کرنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔" اس رائے
...اتفاق کرنا مشکل ہے بلکہ نفس مضمون کی گہرائی، معنویت اور سماجی شعور کے
...سے غور کیا جائے تو اردو ناول کی باقاعدہ ابتدا ہی پریم چند کے ناولوں سے ہوتی ہے
...بات ہے کہ ہمارا ادب اس پر ہنوز کوئی قرار واقعی اضافہ نہیں کر سکا ہے مگر
...کی رفتار ہمیشہ یکساں نہیں رہتی اور ہر فن کی طرح اس فن میں بھی؟

امام اور مجتہد خاص مدت کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو اردو
ناول کا دور تو اب کہیں جا کر شروع ہوا ہے جب سماج اور فرد کے بیچ در پیچ
اور تہ در تہ مسائل کا احساس اور ادراک عام ہوا ہے۔

بہر حال یہ کتاب اردو ناول سے دلچسپی رکھنے والے سبھی اہل علم حضرات کے
لئے غور و فکر کا سامان فراہم کرے گی اور اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔
اسے تنقیدی تجزیے کے اعتبار سے اب تک اس موضوع کی سب سے جامع اور مفید کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر قاضی عبدالستار

"مجاز و حقیقت"

پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری صدر شعبۂ فارسی و اردو جی، ایف کالج شاہجہاں پور کا مجموعۂ کلام ہے۔ موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ نظم و نثر دونوں سے یکساں شغف رکھتے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ موضوعات کی رنگا رنگی کے لحاظ سے انفرادی خصوصیات رکھتا ہے مثلاً ۱۴۰ صفحات کا یہ چھوٹا سا مجموعہ مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے: حقائق، روحانیات، اقبالیات، جلوہ زار فطرت، بزم رومان، غزل و تغزل، درس عمل، سیاسیات، شخصی تاثرات اور تجزیۂ شعری۔

نکہت شاہجہاں پوری نے تجربات و تجزیۂ شعری کے عنوان سے ایک الگ باب قائم کیا ہے اس میں بارہ واقعات بیان کئے ہیں۔ ہر واقعہ تحریک شعری کے اسباب، علل اور نتیجہ انجام کی کہانی سناتا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مذاق متنوع ہے۔ مجموعہ کلام پڑھنے اور لطف اٹھانے کی چیز ہے، جو لالہ رام دیال اگروال پبلشر الٰہ آباد سے ڈھائی روپیہ میں مل سکتا ہے۔

"فرشتے کہتے ہیں"

یہ ایک کتاب ہے مصنف کا نام "طاہر" درج ہوا ہے تصنیف کے جملہ حقوق دائمی طور پر بحق مصنف محفوظ ہیں۔ لیکن اقوال و مضامین نقل کرنے کی عام اجازت بھی ہے۔ صفحات ۱۴۳ ہیں۔ قیمت صرف تین روپے ہے۔ مصنف ہی اس کا ناشر ہے۔

تصنیف پر کسی صنف کا حکم لگانا دشوار ہے۔ ابتدا ایک نظم سے ہوتی ہے جو قافیے کی "بے معنی قید" کے لحاظ سے پابند ہے لیکن جسے بحر کی آوارگی نے ناموزوں بنا دیا ہے۔ کہیں تو مصنف نے مابعد الطبیعیاتی موضوعات کو بچوں کی طرح تالی بجا بجا کر چھونے کی کوشش کی ہے اور کہیں آغا حشر کے ان ناقابل یقین ڈراموں کی یاد تازہ کر دی ہے جنھیں دیہاتوں کی ناٹک ٹولیاں اب بھی کھیلتی ہیں۔

تاہم کتاب بہت دلچسپ ہے۔ بس ذرا "بعد از وقت" آئی ہے اگر کہیں ۱۹۲۴ء میں چھپ گئی ہوتی تو بہت اہم ہوتی۔

انجمن ترقی اردو علی گڑھ، پبلشر نذیر حسین، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا